انجمن ترقی اردو ہند

کا

ہفتہ وار اخبار

چندہ
قیمت سالانہ
تین روپیہ
ایک پرچہ
تین آنہ
تاریخ اشاعت
۱، ۸، ۱۵، ۲۲

رجسٹرڈ نمبر
اے ۹۲۲
ٹیلیفون نمبر ۲۹
تار کا پتہ
"انجمن"
علی گڑھ

ہماری زبان

ایڈیٹر :- آل احمد سرور

جلد ۱۶	علیگڈھ - ۱۰ جنوری ۱۹۵۷ ع	شمارہ ۲۹

رفتار

خلیل الرحمن اعظمی

اردو میں مختصر افسانہ نگاری سے متعلق آج کل عام طور پر ایک سوء ظن سا رہنے لگا ہے۔ ہمارے تنقید نگار عام طور پر شاعری کے تنقید نگار ہو کر رہ گئے ہیں یا پھر تنقید کی تنقید لکھی جا رہی ہے۔ اس مسئلہ پر اگر بات چیت کے دوران میں کچھ کرید کی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ لوگ اس سوال کو ٹالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بہت اصرار کیجئے تو جواب ملے گا کہ آج کل افسانہ نگاری کا کچھ ایسا زور نہیں اس لئے بظاہر اس کا مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ ان دنوں اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ رسالے پڑھتے وقت تنقید اور شعر کا حصہ تو دلچسپی سے پڑھتے ہیں لیکن افسانوی حصے کو چھوڑ دیتے ہیں۔ جیسے افسانہ پڑھنا تضیع اوقات ہے۔ اسی لئے نئی پود کے افسانہ نگاروں کے بارے میں وہ کھل کر کوئی رائے دے بھی نہیں سکتے۔ مستقبل کی طرف سے مایوسی کا جو اظہار ان کی طرف سے ہوتا ہے اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ہمارے اکثر لکھنے والے یا تو افسانہ نگاری ترک کر چکے ہیں یا دوسرے انحطاط میں۔ اور یہ کہ ادبی کتابیں چھاپنے والے پبلشر آج کل مختصر افسانوں کے مجموعے بہت کم چھاپ رہے ہیں۔ حالانکہ اگر غور کیا جائے تو اس بات کا آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جہاں تک عام پڑھنے والوں اور کتابیں خریدنے والوں کا تعلق ہے ان کی دلچسپی افسانوی ادب سے کم نہیں ہوئی ہے یہ ضرور ہے کہ وہ [illegible] اب معیاری اور ادبی افسانے پڑھنے کے بجائے جاسوسی افسانے اور عریاں دلکش کہانیوں پر ٹوٹتے ہیں۔ جہاں تک کتابیں خریدنے اور پڑھنے والوں کی عام آبادی کا تعلق ہے اگر

اس کی مردم شماری پر ادب کی ترقی یا انحطاط کا اندازہ لگایا جائے تو تقسیم سے قبل جب ہمارے یہاں معیاری ادبی افسانے کی کتابیں بہت مقبول تھیں اور کرشن چندر، منٹو، عصمت اور ممتاز مفتی کے افسانے بہت پڑھے جاتے تھے اس دور میں بھی ان سے زیادہ مقبولیت ایم۔ اسلم، تیرتھ رام فیروزپوری اور رئیس احمد جعفری وغیرہ کو حاصل تھی اور ان مقبول ادیبوں نے اپنی کتابوں سے جتنا معاوضہ اپنے ناشروں سے وصول کیا ہوگا ہمارے ادبی اہمیت رکھنے والے افسانہ نگاروں کو اس کا عشر عشیر بھی نہ ملا ہوگا۔ پھر اس زمانہ میں بھی اگر آپ غور سے کام لیں تو اندازہ ہوگا کہ کرشن چندر، منٹو، عصمت اور ممتاز مفتی سے کم بکنے والی کتابیں بیدی، غلام عباس اور حیات اللہ انصاری کی تھیں۔ چند گنے ہوئے افسانہ نگاروں کی کتابیں تو عام آدمی بھی پڑھ لیتے تھے لیکن بیدی وغیرہ کی کہانیاں عام آدمیوں کو کچھ خشک معلوم ہوتی تھیں اس لئے ان کو صرف ادبی شعور رکھنے والے ان کہانیوں کو پڑھتے اور سراہتے تھے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تقسیم سے قبل ہماری مختصر افسانہ نگاری جو ادبی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کا غالب رجحان بھی [illegible] جنسی لذت کی طرف تھا۔ وہ سنسنی چاہے سیاست اور انقلاب سے پیدا کی جائے یا فحاشی اور نفسیاتی الجھنوں سے۔ تقسیم کے بعد کچھ دنوں کے لئے اسی سنسنی کا مرکز فسادات کا موضوع بن گیا اس لئے اس زمانہ کی مقبول ترین کتابیں "ہم وحشی ہیں" [illegible] لیکن جوں جوں انتشار اور بے چینی ختم ہوتی گئی اور نئے دور کے آغاز کے ساتھ لوگوں کی تحریروں میں سنجیدگی، توازن اور غور و فکر کے عناصر داخل ہونے لگے تو ہماری افسانہ نگاری سے کلاسکی پڑھنے والوں کا رشتہ آہستہ آہستہ ٹوٹنے لگا اور ہمارے پبلشر بھی ان افسانہ نگاروں سے آنکھیں پھیرنے لگے۔ لیکن بازار مندا ہو جانے کا مطلب یہ تو نہیں کہ

بیجدہ پڑھنے والے بھی افسانہ نگاری کو طلاق دے دیں۔ سنجیدہ پڑھنے والے اگر تحقیقی اور علمی کتابوں کی خشکی کو گوارا کر لیتے ہیں تو کیا ہمارا افسانہ ایسا گیا گزرا ہے کہ ان کو بالکل ہی روکھا پھیکا نظر آئے۔ میرا خیال ہے اس مسئلے پر ہم سب کو غور کر کے اپنے ذہنوں کا تجزیہ کرنا چاہئے۔

تقسیم کے بعد افسانہ نگاروں کی جو نئی پود پیدا ہوئی ہے اس میں سب سے زیادہ اے۔ حمید کی کتابیں پڑھی گئی ہیں۔ ان کے افسانوں میں رومانیت غالب ہے اسی لئے غالباً عام پڑھنے والوں کو اس میں لذت کا عنصر مل جاتا ہے لیکن جن لوگوں نے اے۔ حمید کے دوسرے ہم عصروں کی کہانیاں بھی پڑھی ہیں ان سے پوچھا جائے تو ہر شخص یہی کہے گا کہ اس نسل میں صحیح معنوں میں بلند پایہ افسانے جن افسانہ نگاروں نے دئے ہیں ان میں اشفاق احمد، شوکت صدیقی اور انتظار حسین ہیں۔ ان لوگوں کے تو ایک آدھ مجموعے چھپے بھی ہیں لیکن کئی اچھے لکھنے والے ایسے ہیں جن کی کہانیاں ابھی صرف رسالوں میں شائع ہوئی ہیں۔ ایسے افسانہ نگاروں میں خیرالدین احمد، سید خلیل احمد، ابن الحسن، جیلانی بانو، واجدہ تبسم، جاوید جعفری، امجد الطاف، شام ملک، عوض سعید، غلام علی چودھری اور صادق حسین کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اب ان لکھنے والوں کی چھان بین کیجئے اور کچھ افسانے رسالوں سے تلاش کر کے پڑھ ڈالئے۔

شوکت صدیقی کا «تیسرا آدمی»، «تانتیا» اور «زخم دل اگر نہ ہوتا» تو پہلے ہی مشہور ہو چکے ہیں اب ان کے نئے افسانے «اندھیرا اور اندھیرا»، «مردہ گھر»، «شریف آدمی»، «چور دروازہ»، «خداداد کالونی»، «ٹیلیفون جی» اور «کوکا بیلی» اور پڑھ لیجئے۔ اشفاق احمد کا «گڈریا» نقوش کے افسانہ نمبر میں چھپ چکا ہے اور ۱۹۵۴ء کے بہترین ادب (مکتبہ اردو) میں بھی آ چکا ہے۔ انتظار حسین کا ایک مجموعہ «گلی کوچے» پہلے چھپ چکا ہے «کنکری» ابھی حال ہی میں مکتبہ جدید نے شائع کیا ہے۔ ان کے افسانے «آخری موم بتی» اور «اجودھیا» کئی انتخابات میں بھی آ چکے ہیں۔ خیرالدین احمد کے افسانے «رگِ سنگ»، «بہتا خون ابلتا خون»، «چاندنی اور اندھیرا»، «پکا گانا»، «کھوئی ہوئی منزل»، «کچھ عجیب سا» اور «گھیا» نقوش، ساقی اور نیا دور وغیرہ میں شائع ہوئے ہیں۔ سید خلیل احمد کے افسانے «مالک»، «شمع جلتی ہے تو» اور «سفینہ آتا» نقوش اور ادب لطیف میں چھپ چکے ہیں۔ ابن الحسن کا «وقت یاتری»، جیلانی بانو کا «نئی عورت»، «موم کی مریم» اور «بھنور اور چراغ»، واجدہ تبسم کا «تین جنازے» اور «گلستاں سے قبرستان تک»، جاوید جعفری کا «باگے پاک پروردگار»، شام ملک کا «رام»، عوض سعید کا «پیدل صاحب» اور «نانی اماں»، امجد الطاف کا «لاچونے کی کھیا»، صادق حسین کا «شعلوں کے سائے میں» اور غلام علی چودھری کا «شگون اول» اور «اینٹوں کا چہرہ» یہ سارے افسانے نقوش، ادب لطیف، ادبی دنیا، نئی تحریریں، شاہراہ، نیمروز اور صبا وغیرہ میں شائع ہو چکے ہیں۔

ان سارے نئے افسانوں کو اگر غور سے پڑھا جائے تو ایک بے درد سے بے درد نقاد بھی اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ یہ افسانے ہر اعتبار سے معیاری ہیں اور ہمارے ادب میں قابل قدر اضافہ۔ البتہ یہ اندازہ بھی ہوگا کہ غور و فکر، مشاہدہ، بے لاگ حقیقت نگاری، اور فنی سوجھ بوجھ کا عنصر ہمارے لکھنے والوں میں اب کچھ زیادہ ہی بڑھ رہا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اب ہمارے لکھنے والے صرف ایک ہی موضوع کے گرد نہیں گھوم رہے ہیں بلکہ ہر ایک نے اپنے ماحول اور اپنی شخصیت کے اعتبار سے صرف انہیں مسائل کو برتنے کی کوشش کی ہے جو اس کے فنی ادراک کا جزو بن چکے ہیں۔ اس لئے ان افسانہ نگاروں کی کہانیوں پر مغرب کے کسی افسانہ نگار کے چربے یا نقل کا گمان بھی نہیں ہوتا۔ (حال ہی میں کچھ لوگوں نے تحقیق کی ہے کہ منٹو اور کرشن چندر کی بہت سی کہانیاں فرانس اور انگلستان کے افسانہ نگاروں کی اڑائی ہوئی ہیں)۔ اب اگر افسانہ نگاروں کی نئی پود نے تیس چالیس کی تعداد میں بھی ایسے افسانے ہمارے ادب کو دے دئے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارا افسانہ زندہ بھی ہے اور اس میں گہرائی بھی آتی جا رہی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمارے یہاں کے عام لوگ اب بھی رئیس احمد جعفری، رشید اختر ندوی، نسیم حجازی اور دت بھارتی پر ٹوٹیں اور کتابوں کے پبلشر انہیں مقبول ترین لکھنے والوں سے محبت کریں۔ اس فضا کو بدلنے کے لئے ابھی ہمیں بہت ترقی کرنی ہے۔ ابھی تو ہمارے اچھے لکھنے والوں کو کچھ دن یہی شکوہ رہے گا کہ «بیکار ادب کے جنجال میں پھنسے اس سے زیادہ نفع تو کرم کلّے کی کاشت میں ہے»

ہماری زبان

۱۵ جنوری ۱۹۵۷ء

ادیب اور آزادی

ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس میں ادیب اور آزادی کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا تھا اور جیسی کہ توقع تھی اس مسئلے پر خوب جم کر طبع آزمائی کی گئی۔ ایک گروہ کا خیال تھا کہ ادیب کو مکمل آزادی ہونی چاہئے۔ وہ جو چاہے لکھے، کسی سماج کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس پر پابندی عائد کرے۔ دوسرا گروہ کہتا تھا کہ ادیب کو سماج کے خلاف کچھ نہ لکھنا چاہئے۔ تیسرا گروہ صرف جمالیاتی تقاضوں کو ضروری سمجھتا تھا اور کسی پابندی کا قائل نہیں تھا۔ اس بحث میں سیاسی گروہ بندی کا عکس بھی شامل ہو گیا تھا۔ یعنی کچھ لوگ کہتے تھے کہ صرف سوشلسٹ سماج ہی میں ادیب کو مکمل آزادی میسر آسکتی ہے اور کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ آمرانہ حکومتوں میں ادیب کو حقیقی آزادی حاصل ہو ہی نہیں سکتی۔ یعنی کثرت تعبیر سے خواب کچھ پریشان سا ہو گیا تھا۔

ادب اور آزادی کا مجرد تصور آسان ہے۔ مگر اس کی مکمل تصویر آسان نہیں۔ ادب بہر حال زندگی کی تخیلی ترجمانی ہے۔ یہ صرف تخیل کی ساحری یا حقیقت کی بے شعور عکاسی نہیں۔ ادیب اپنے تخیل کی شمع سے ان حقائق کو روشن کرتا ہے جو عام نگاہوں سے پوشیدہ تھے۔ وہ عام حقائق کو الٹ پلٹ کر لوگوں کو بصیرت عطا کرتا ہے۔ وہ اپنے خوابوں کے ذریعے سے بالاتر حقائق کی توسیع کرتا ہے۔ اگر آپ ادیب کے ذہن پر پابندی عائد کرنا چاہیں، اُسے ایک خاص راستے پر چلنے پر مجبور کردیں، اس کے سامنے ممنوعات کی ایک دیوار کھڑی کردیں تو اس کی تخلیقات بے جان ہو جائیں گی۔ زندگی کی تلخیاں ہی اسے ادب میں خوابوں کا رنگ محل بنانے کی دعوت دیتی ہیں۔ اگر اس کی زبان پر تالا یا اس کے قلم پر مہر ہو تو یا تو وہ بجھ کر رہ جائے گا یا ان پابندیوں کے خلاف بغاوت کرے گا۔ اس لئے ادیب کے لئے آزادی اتنی ہی ضروری ہے جتنی زندگی کے لئے تازہ ہوا یا گرمی یا سورج کی روشنی۔ اس کا ذہن غلام نہیں ہونا چاہئے۔ اس کا خیال پابہ زنجیر نہیں ہونا چاہئے۔ ادیب قوم کا ضمیر ہوتا ہے جب تک ضمیر کی یہ آواز اپنا کام کر رہی ہے قوم کو کوئی ذہنی خطرہ نہیں ہے۔ جب یہ آواز بند ہو جائے تو قوم کی ذہنی موت واقع ہو سکتی ہے۔ ادیب گو ایک سماج کا فرد ہے۔ مگر سماج کے دوسرے افراد سے زیادہ، سماج کی فلاح کی خاطر اسے قوم اور حکومت پر نکتہ چینی کا حق حاصل ہے۔ اگر کوئی سماج ادیب کو حکومت پر نکتہ چینی کا حق نہیں دیتا تو وہ ادیب کے منصب کا پاس نہیں رکھ سکتا۔ سوشلسٹ حکومتوں میں جہاں کہیں ادیب پر احتساب ہوا ہے اس کا نتیجہ ادب کے حق میں اچھا نہیں نکلا۔ ادب صحافت یا سرکاری دستاویز یا واقعات کی کھتونی بن گیا۔

چنانچہ آزادی ادیب کا حق ہے اور کوئی اچھا اور باشعور سماج اسے اس آزادی سے محروم نہیں کر سکتا۔ مگر آزادی کی بھی پابندیاں ہوتی ہیں۔ آزاد رہنے کے بھی شرائط ہوتے ہیں۔ آزادی کے نام پر انفرادیت پرستی یا سماج دشمنی یا مریض ذہن کی عکاسی ادیب کو زیب نہیں دیتی۔ جب سماج کا شکنجہ بہت سخت ہو تو ادیب کو حق پہنچتا ہے کہ وہ فرد کی آزادی پر اصرار کرے۔ جب سماج کی بنیاد غیر منصفانہ ہو تو وہ اسے بدلنے کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ جب زرد رنگ کو صحت کی علامت سمجھا جائے تو وہ فصد کھلوانے کا مشورہ دے سکتا ہے۔ جب کٹرپن، روایت پرستی، یا اقتدار پرستی، افراد کی زندگی پر پیر تسمہ پا کی طرح مسلط ہو تو ادیب کا فرض ہے کہ اس کے خلاف آواز بلند کرے۔ مگر ادیب کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے بلند منصب سے فائدہ اٹھا کر سماجی زندگی کی بنیادیں ہلا دے، اجتماعی روح کو کچل دے، اشتراک باہمی اور تعاون کے تقاضے کو توڑ پھوڑ دے۔

یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اس کا فیصلہ کون کرے گا کہ سماجی خیر کیا ہے، ذہنی صحت کسے کہتے ہیں۔ فرد کی آزادی کس حد تک سماج کے لئے مفید ہے اور کہاں مضر ہو جاتی ہے۔ کیا ادیب کی آزادی کا بھی کوئی چارٹر مرتب کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان مسائل کا دو اور دو چار کی طرح کوئی فارمولا نہیں بنایا جا سکتا۔ کوئی ایسا پیمانہ ادب میں تو ممکن نہیں ہے جو ابد تک کام دے۔ ادب سائنس تو نہیں ہے جس میں ایک قانون دوسرے قانون کی جگہ لے لیتا ہے، جس میں ایک صداقت دوسرے کی لاش پر قائم ہوتی ہے۔ ادب کے معیار میں توسیع ہوتی رہتی ہے اسی وجہ سے سماجی خیر، ذہنی صحت، فرد کی آزادی کی حد کا تعین بھی ذہین لوگ کر سکتے ہیں۔ جو آزادی کے مرد میدان ہیں جنھیں سالک راہ طریقت کہا جا سکتا ہے۔ مومن کے جہاں کی طرح ادیب کے جہان کی بھی حد نہیں ہے۔ سوائے ان حدود کے جو اس کا سماجی اور جمالیاتی شعور اس پر عائد کردے۔ افلاطون کی مثالی حکومت یا برنارڈ شا کے مرد دانا کی حکومت کی طرح ادیب

کی حکومت قائم کرانا ہمارا مقصد نہیں۔ ہاں حکومتوں میں ادیب کو خریدنے کا نہیں اس کے منصب کا احترام کرنے کا جذبہ پیدا کرنا مقصود ہے۔ ادیب سیاسی تصور کی خاطر، اس کی کسی مخصوص تحریک پر بھی معترض ہو سکتا ہے۔ اچھا سماج کبھی اسے اس مقدس کام سے روکنے کی کوشش نہیں کرے گا اور جب تک یہ اچھا سماج موجود نہیں ہے، ادیب کا کام برابر جاری رہے گا۔

جن سنگھ اور اردو

پنجاب کی ایک اطلاع ہے کہ جن سنگھ نے اپنے انتخابی منشور میں اردو کو ایک فرقہ پرست زبان بتایا ہے اور یہ بشارت بھی دی ہے کہ جب اس کی حکومت ہوگی تو وہ اردو سے اس ملک کو پاک کر دے گی۔ ہمیں اس پر فارسی کا ایک مشہور شعر یاد آیا ؎

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

زبانوں کا نہ کوئی مذہب ہوتا ہے نہ کوئی ذات، نہ کوئی فرقہ۔ اردو نہ کسی ایک مذہب کی زبان ہے، نہ کسی ایک فرقے کی ملکیت۔ جن سنگھ کی اطلاع کے لئے ہم صرف یہ کہنا کافی سمجھتے ہیں کہ اس زبان کو ہر مذہب کے لوگوں نے اپنی تبلیغ اور پرچار کے لئے استعمال کیا ہے۔ آریہ سماج کی بھی بیشتر کتابیں اردو میں موجود ہیں۔ حقائق کا خون کر کے اور نفرت کے جذبات بھڑکا کر کچھ دن تک لوگ ملک کی ترقی میں روڑے اٹکا سکتے ہیں مگر بالآخر انھیں وقت کے بہاؤ کا ساتھ دینا پڑتا ہے۔ انتخابات کا جادو بھی عجیب ہے کہ چند ووٹوں کی خاطر پارٹیاں کیسی کیسی قلم بندی کرتی ہیں۔

رہی یہ بشارت کہ جن سنگھ کی حکومت آئی تو اردو کا خاتمہ ہو جائے گا اس کے متعلق بس اردو کا یہ مشہور شعر کافی ہے ؎

خدا آجائے ناداں دوا جس نے تو کرے
ہو تو بھی جو رہے تو یہ خدا وہ دن تو کرے

روس میں ہندستانی زبانیں

اپنے قیام کے پچیس سالہ عرصے میں غیر زبانوں کی لغات کے اشاعت گھر نے دنیا کی بالکل مختلف زبانوں کی کوئی پانچ سو فرہنگیں شائع کی ہیں۔

ہندستانی زبانوں کی ڈکشنریوں کے پہلے ایڈیشن کا کام دوسری جنگ عظیم سے قبل شروع کیا گیا تھا۔ لیکن جنگ کی وجہ سے یہ کام درمیان میں رہ گیا۔ پھر ۱۹۵۱ء میں جاکر ایک اردو روسی لغت اور ۱۹۵۳ء میں ہندی روسی لغت شائع کی گئی۔ ان دونوں کا مولف مشہور و معروف روسی ماہر علم ہند اکاڈمیشین باراننکوف کے سر ہے۔ ہر لغت روزمرہ استعمال کے تقریباً تیس ہزار معاشرتی اور سیاسی الفاظ پر مشتمل ہے اور عوام نے ان دونوں کو بہت پسند کیا ہے۔

ہندستان اور سوویت یونین کے بڑھتے ہوئے تعلقات نے سوویت عوام نے ہندستان، معاشیات، پالیسی اور تہذیب سے گہری دلچسپی پیدا کر دی ہے۔ ہندی، اردو، پنجابی، مراٹھی، تامل، تلگو اور ہندستان کی دیگر مروجہ زبانوں میں مہارت رکھنے والے افراد کی تعداد سوویت یونین میں روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ اسکولوں اور دوسرے تعلیمی اداروں کے طالب علم ہندستان کے جغرافیے اور اس کی معاشیات، تہذیب اور تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں۔ امسال ماسکو میں ایک بورڈنگ اسکول قائم کیا گیا ہے۔ جہاں روایتاً یورپ کی زبانوں کے بجائے طالب علم دوسری جماعت سے ہندی، اردو اور چینی زبانوں کی تعلیم حاصل کیا کریں گے۔ سوویت یونین میں جس طرح رابندر ناتھ ٹیگور، پریم چند، کرشن چندر، ملک راج آنند اور دوسرے ہندستانی ادیبوں کے مداحوں میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے، بالکل اسی طرح ہندستانی مصنفوں کی کتابوں کی تعداد بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ قدرتی طور پر سوویت یونین کا ہر وہ فرد جو کسی بھی ہندستانی زبان کی واقفیت رکھتا ہے اپنے پسندیدہ مصنف کی اصل تخلیقات کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے اس لئے ہر نئی لغت کی اشاعت ملک کی تہذیبی زندگی میں ایک عظیم اور مسرت انگیز واقعے کی حیثیت رکھتی ہے۔

اب سوویت یونین میں ہندستانی ڈکشنریوں کی اشاعت کو بہتر کرنے کے لئے عملی اقدامات کئے جا رہے ہیں۔ غیر زبانوں کی لغات کے دارالاشاعت میں جنوب مشرقی ایشیائی زبانوں میں شائع کی جانے والی لغتوں سے متعلق ایک خصوصی دفتر او دست قائم کیا گیا ہے۔ اس دفتر کا پلان ۱۹۶۰ء میں دس ہزار الفاظ پر مشتمل ایک روسی اردو لغت شائع کرنے کا ہے۔ اس وقت مرتبوں کا ایک گروہ اس لغت کی تیاری میں لگا ہوا ہے لیکن اس سے بھی پہلے ایک ہندی روسی فرہنگ ماہرین لسانیات کے پاس پہنچ جائے گی جو مشہور فرہنگ نویس بیسکرودنی اسکو ترتیب دے رہے ہیں۔ نکالا روسی لغت اگلے سال منظر عام پر آجائے گی۔ اس میں معاشرتی، سیاسی، علمی اور روزمرہ استعمال میں آنے والے تقریباً ۴۰ ہزار الفاظ ہوں گے۔ ایک عظیم الشان اردو روسی لغت کی ترتیب کا کام شروع کیا جا چکا ہے جو پچاس ساٹھ ہزار الفاظ پر مشتمل ہوگی اپنے مواد کے ذخیرے میں یہ لغت نہایت مفید ثابت ہوگی جو غیر معمولی طور پر مشکل ہوتے ہیں۔ ــــــ روسی ہندی اور روسی اردو زبانوں کی لغات کی تیاری میں جدید ہندستانی مصنفوں کی تصانیف اور رسالوں، اخباروں سے استفادہ کیا جا رہا ہے۔

انجمن کی خبریں

نان پارہ (بہرائچ) نان پارہ (ذریعہ ڈاک) یہاں انجمن ترقی اردو کی مجلس عاملہ کا ایک جلسہ ڈاکٹر طاہر علی بیگ کی صدارت میں ہوا۔ ممبران مجلس عاملہ کے علاوہ شہر کے ممتاز اشخاص نے جلسے میں شرکت کی۔

جلسہ میں پچھلی تجاویز کا جائزہ لیا گیا اور پرائمری درجات میں اردو تعلیم جاری کرانے کے لئے انجمن کی کوششوں پر اطمینان کا اظہار کیا گیا۔ اور ایک " اردو کانفرنس اور آل انڈیا مشاعرہ" منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور اس کے لئے ایک سب کمیٹی صدر صاحب کی قیادت میں بنادی گئی۔ اس پروگرام کو کامیاب بنانے کے لئے اپنی رپورٹ جلد دے گی۔

یہاں جنتا جونیر ہائی اسکول کی "مینجنگ کمیٹی" کا ایک جلسہ ہوا جس کا سلسلہ تقریباً ۲ گھنٹہ جاری رہا۔ جلسے میں مقامی ممبران کے علاوہ باہر کے ممبروں میں ضلع کے مشہور کانگریسی لیڈر شری مدن لال ایم۔ ایل۔ اے اور سید محمود حسن نے شرکت کی۔

بمبئی ۲۸ دسمبر۔ انجمن ترقی اردو شاخ بمبئی کے زیر اہتمام صابو صدیق انسٹی ٹیوٹ میں ایک انٹر اسکولز اردو انعامی تقریری مقابلہ ہوا جس میں بمبئی کے ۱۰ اسکولوں کے ۱۱ طلباء اور طالبات نے حصہ لیا اردو کی مشہور افسانہ نگار خاتون عصمت چغتائی نے صدارت فرمائی۔

طلبا نے "اردو ادب اور وقت کے تقاضے" "مذہب اور سیاست" اور "اگر میں وزیر تعلیم بن جاؤں" کے عنوان سے تقریریں کیں۔

آخر میں انجمن کے جنرل سکریٹری مدن موہن کالیہ صاحب نے انجمن کے اغراض و مقاصد اور کارروائیوں پر روشنی ڈالی۔

صدر صاحبہ نے تقریر کے دوران میں اپنے خیالات ظاہر کرتے ہوئے انجمن کو اس کی کارروائیوں پر مبارکباد دی۔

اس کے بعد انعامات تقسیم کئے گئے اور عصرانہ دیا گیا۔

بنارس ۵ جنوری۔ انجمن ترقی اردو شاخ بنارس کی مجلس عاملہ کا ایک جلسہ ۵ جنوری کو بابو کرشن موہن صاحب کی زیر صدارت ہوا۔ اس جلسے میں بنارس میں ریجنل کانفرنس کرنے کی تجویز منظور ہوئی اور یہ طے ہوا کہ یہ کانفرنس ۹۔۱۰ جنوری کو کی جائے۔ کانفرنس کے سلسلے میں حسب ذیل حضرات پر مشتمل ایک کمیٹی بنادی گئی۔

بابو کرشن موہن۔ داتار سول، بابو شیوناتھ پرشاد، ساحر انصاری، شوکت مجید، احمد مکرم ہاشمی، محمد یوسف، محمد ادریس، پروفیسر عبدالباری، آفتاب احمد، محمد نذیر بنارسی، ابرار صاحب، آغا رشید منظر، محمد الیاس اور جوہر صدیقی۔

کمیٹی کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اور ممبران کو شامل کرسکتی ہے۔

بمبئی انجمن ترقی اردو (شاخ بمبئی) نے بمبئی کے اردو نواز احباب کی ایک بہت بڑی نفسیاتی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ عام طور پر مشاعروں میں یہ ہوتا آیا ہے کہ منتظمین مشاعرہ نے شعرا کی ایک طویل فہرست مرتب کرلی اور مشاعرہ میں چار پانچ شعر سنانے کی قید لگادی۔ چنانچہ نہ سامعین کی تسکین ہوتی ہے اور نہ ہی شاعر اپنے کلام کا وہ حصہ پوری طرح سے سنا سکتے ہیں جسے وہ سنانے کے قابل تصور کرتے ہیں۔

انجمن ترقی اردو شاخ بمبئی کے زیر اہتمام مخصوص نشستوں کا سلسلہ شروع ہوا ہے جس کی نوعیت یہ ہوتی چاہئے کہ صرف ایک شاعر کو مدعو کیا جاتا ہے اور اس سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ ایک مختصر تقریر اپنی شاعری اور اپنی زندگی سے متعلق کریں۔ اور بعد میں اپنا کلام سنائیں۔ نشست ٹھیک سات بجے شام شروع ہوجاتی ہے اور ساڑھے آٹھ بجے ختم ہوجاتی ہے اس مدت میں شاعر اپنے وطن، اپنی تعلیم، شاعری کی ابتدا،

کن شعراء سے متاثر ہوئے اور اردو شاعری کے متعلق اپنے نظریہ کی بابت تقریر فرماتے ہیں اور بعد میں اپنی شاعری کے ابتدائی دور، درمیانی دور اور موجودہ دور کا کلام پیش کرتے ہیں۔

انجمن کی طرف سے شعرا کی خدمت میں نقدی یا تحفہ کی صورت میں نذرانہ پیش کیا جاتا ہے

اس دلچسپ سلسلے کی پہلی کڑی جناب شکیل بدایونی صاحب کے کلام اور تقریر کی نشست تھی جو یکم دسمبر ۱۹۵۶ء کو منعقد ہوئی۔

جناب علی سردار جعفری صاحب نے ۵۔ جنوری ۱۹۵۷ء کو اپنا کلام سنایا۔

تیسری نشست میں خمار بارہ بنکوی صاحب ۹۔ فروری کو اپنا کلام پیش کریں گے۔

ادبی نشستوں کا یہ سلسلہ بمبئی کے ارباب ذوق میں بہت پسند کیا جا رہا ہے اور مصارف کے لئے عطیات فراخدلی سے دئے جا رہے ہیں۔

انبالہ (پنجاب)

ملک ادم پرکاش صاحب۔ آنند جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو پنجاب اطلاع دیتے ہیں کہ

انجمن ترقی اردو پنجاب کا ایک اہم جلسہ جناب اے جی ایبل کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ جس میں سب سے پہلے انجمن ترقی اردو پنجاب کے جنرل سکریٹری ملک ادم پرکاش آنند نے اردو کانفرنس سب کمیٹی کی رپورٹ پیش کرتے ہوئے ممبروں سے درخواست کی کہ وہ پوری دلچسپی کے ساتھ انجمن کی سرگرمیوں میں حصہ لیں۔ اس جلسے میں طے پایا کہ اپریل کے مہینے میں اردو کانفرنس کی جائے جس کی تاریخوں کا اعلان جلد کر دیا جائے گا۔

جناب کرشن لال شرما نے اپنی رائے پیش کرتے ہوئے کہا کہ انجمن کا ایک وفد حکومت پنجاب سے ملے اور اپنی شکایات پیش کرے۔ اس سلسلے کی رپورٹ تیار کرنے کے لئے پروفیسر مینا

پروفیسر آزاد اور اے۔ جی ایبل پر مشتمل ایک کمیٹی بنا دی گئی

ملک ادم پرکاش آنند جنرل سکریٹری نے جن سنگھ کے الیکشن مینی فسٹو کے اس حصے کے خلاف ایک تجویز پیش کی جس میں جن سنگھ نے اعلان کیا ہے کہ اردو ایک فرقہ پرست زبان ہے اور اس زبان کے ہوتے ہوئے ملک میں فرقہ پرستی کو تقویت پہنچتی ہے اور جب بھی ہمارے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور آئے گی ہم اس زبان کو بالکل ختم کر دیں گے۔

اس تجویز میں مانگ کی گئی ہے کہ جن سنگھ یہ الفاظ اپنے مینی فسٹو سے خارج کر دے ورنہ انجمن اپنے حقوق کی حفاظت کے پیش نظر کوئی قدم اٹھانے پر مجبور ہوگی۔

اس قرارداد کے منظور ہونے کے بعد جلسہ برخواست ہوا۔

غزل

دیدۂ تر نے عجب جلوہ گری دیکھی ہے
غم نے جس شاخ کو پالا وہ ہری دیکھی ہے

ہائے کس بت کی خدائی کا بھرم ٹوٹا ہے
خلق نے آج ان آنکھوں میں تری دیکھی ہے

نہ ملا پر نہ ملا عشق کو انداز جنوں
ہم نے مجنوں کی بھی آشفتہ سری دیکھی ہے

آب و گل، غنچہ و گل، شمس و قمر، دیدہ و دل
کن جالوں میں تری پردہ دری دیکھی ہے

ہاں کبھی کھل نہ سکا پھول پہ مضمون بہار
اے صبا ہم نے تری نامہ بری دیکھی ہے

انور معظم

بقیہ مراسلات

بہت نازک بحث ہے۔ میں شفیق صاحب کو اس بحث کے لئے مستحق مبارکباد سمجھتا ہوں ضرورت ہے کہ مراسلہ کے دائرہ سے نکل کر یہ موضوع ایک گرانقدر مقالے کا عنوان بنے۔

خبرنامہ میں بہار و مغربی بنگال کی طرف مزید توجہ کی ضرورت ہے۔ تحریک علاقائی زبان کے سلسلے میں جو محضر نامہ ریاست بہار نے صدر جمہوریہ کے نام پیش کیا ہے اس کے اہم نکات شائع کریں اس یادداشت میں ریاست بہار میں اردو کے متعلق پرشش قیمت اعداد و شمار دئے گئے ہیں

اردو کی تعلیم جدید سے متعلق رسالہ شاعر بمبئی کی یہ رائے مناسب ہے کہ مرکزی انجمن ترقی اردو ایک اردو کمیشن مقرر کرے۔ جو تمام صوبوں، ضلعوں، شہروں اور قصبوں کا دورہ کرے اور اس کے لئے ہر صوبہ میں چند ادیبوں کا وفد مقامی ریاستی انجمنوں کے زیر اہتمام بنایا جائے۔ مجھے امید ہے کہ آپ آئندہ اداریہ میں خاص کر کے اس نکتہ پر ضرور اظہار خیال کریں گے۔ مولوی عبدالحق صاحب نے بھی راجپوتانہ اور سی پی وغیرہ میں اس طرح کا کام کیا تھا جو جائزہ زبان اردو کے نام سے طبع ہوا تھا اس میں اردو کے متعلق دلچسپی اور کارآمد معلومات موجود ہیں

شاہ مقبول احمد بگہراد

سنٹرل کلکتہ کالج کلکتہ

اردو دنیا

اردو اور اسلام

حیدرآباد۔ ۱۴ جنوری۔ آندھرا پردیش کے وزیر اعلیٰ مسٹر ایس گوپالا ریڈی نے آج ان لوگوں کی سخت مذمت کی۔ جو اردو کا ناتا مذہب اسلام یا مسلمانوں سے جوڑتے ہیں۔

تیسرے سالانہ انٹر کالجیٹ اردو فیسٹیول کا افتتاح کرتے ہوئے مسٹر گوپالا ریڈی نے کہا کہ اردو سو فیصدی ہندستانی زبان ہے جو ہندستان ہی میں پیدا ہوئی اور ہندستانی کلچر کا ہی ایک اہم حصہ ہے۔ یہ وہ زبان ہے جس کو اس ملک کے لاکھوں عوام بولتے ہیں خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان۔

انھوں نے کہا کہ اردو مسلمانوں کی زبان نہیں ہے نہ تو یہ مشرق وسطیٰ میں بولی جاتی ہے اور نہ مکہ میں اس کا رواج ہے۔

مسٹر ریڈی نے کہا کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر وہ شخص جو مسلمان ہے اردو ہی بولتا ہو۔ کیرالا، مدراس اور بنگال میں مسلمان ان علاقوں کی زبان بولتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ لوگ غیر مسلم ہیں۔ اسی طرح مشرقی پاکستان میں بنگالی سرکاری اور مادری زبان ہے۔ مگر اس کا بھی کوئی یہ مطلب نہیں نکال سکتا کہ وہاں لوگ غیر مسلم ہیں۔

مسٹر گوپالا ریڈی نے ہندی کو سنسکرت آمیز بنائے جانے کی کوشش کی سخت مذمت کی اور ہندی اور اردو کو ایک دوسرے سے قریب لائے جانے کی ضرورت پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ ہندی اور اردو ایک ہی زبان ہیں صرف رسم خط بدلا ہوا ہے۔

مسٹر گوپالا ریڈی نے جو آندھرا یونیورسٹی کے پرو چانسلر بھی ہیں۔ یہ تجویز رکھی کہ نصابی کتب دیوناگری اور عربی دونوں طرح کے رسم خط میں شائع ہونی چاہئیں۔

انھوں نے خطرہ ظاہر کیا کہ اگر ٹھوس اقدامات نہیں کئے گئے تو اردو ہندستان سے مٹ جائے گی۔

مسٹر گوپالا ریڈی نے کہا کہ ریاستوں کی نئی حد بندی کے بعد یہ امید پیدا ہو گئی ہے کہ علاقائی زبانوں کو سرکاری طور پر زیادہ سرپرستی مل سکے۔

انھوں نے کہا کہ موجودہ رفتار سے اردو اگلے پچاس سال کے اندر مر جائے گی۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ زبان جس کے پاس زبردست ادبی میراث اور سرمایہ ہے ہمیشہ ہمیشہ ہندستان میں زندہ رہے اس کے لئے ہندی اور اردو کو قریب لانے کی ضرورت ہے۔ تاکہ اردو بھی عوام میں باقی اور مقبول رہے۔

آخر میں مسٹر ریڈی نے کہا کہ یہ بڑی مضحکہ خیز بات ہو گی کہ ہندستان میں جہاں اردو نے جنم لیا ہم اردو سے غفلت برتیں اور پاکستان میں اس کو سرکاری زبان تسلیم کیا جائے۔

مسٹر نہرو نے اقبال کا شعر پڑھا

لکشمی بائی نگر۔ ۱۴ جنوری۔ مسٹر نہرو نے اقبال کی مشہور اردو نظم "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" کا ایک شعر اس وقت پڑھا جب آپ اپنی تقریر میں ہندستانی عوام کی ترقی کے مختلف ادوار کا ذکر کر رہے تھے۔

مسٹر نہرو نے جو کانگریس کا انتخابی منشور پیش کر رہے تھے تالیوں کی گونج میں اقبال کا یہ شعر پڑھا۔

اے آبِ رودِ گنگا وہ دن ہے یاد تجھ کو
اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

اردو کو فوراً قومی زبان قرار دیا جائے

لاہور (بذریعہ ڈاک) پاکستان اورنٹیل کانفرنس نے جس کا اجلاس کل ختم ہو گیا کوئی دو درجن قرار دادیں پاس کی ہیں جن میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ اردو کو فوراً قومی زبان قرار دے کر اسے سرکاری دفاتر میں رائج کیا جائے اور ذریعہ تعلیم بنایا جائے اردو صحافت کی تعلیم کا مرکز قائم کیا جائے۔ طب یونانی کی تعلیم کے لئے بہتر سہولتیں دے کر اسے تسلیم کیا جائے کانفرنس نے مولانا ظفر علی خاں کے انتقال پر ایک تعزیتی قرارداد بھی پاس کی۔

حکومت ہند عنقریب اردو کو دہلی کی علاقائی زبان تسلیم کرے گی

دہلی۔ ۳۰ جنوری۔ آج شری گوپی ناتھ امن نے انکشاف کیا کہ دہلی اسٹیٹ گورنمنٹ نے لسانی کمیٹی سے سفارش کی ہے کہ اردو اور ہندی کو علاقائی زبان تسلیم کیا جائے۔ ان کا خیال ہے کہ مرکزی حکومت جلد اس سفارش کو قبول کرے گی۔ انھوں نے فرمایا کہ فرقہ وارانہ طریقۂ کار کا نتیجہ یہ ہے کہ پنجاب کو اردو میں پاکستانی زبان سمجھا گیا۔ حالانکہ پنجابی اردو جانتے ہیں۔ اور اردو آئین کی چودہ زبانوں میں سے ایک ہے۔ لیکن مردم شماری میں اردو زبان کے بجائے ہندی زبان کو مادری زبان بتایا۔ شری امن نے بتایا کہ ہندی ہندستان کی قومی زبان ہے اور زبان کو کسی پر تھوپنا نہیں چاہیے بلکہ اس طرح سے مقبول بنایا جائے کہ لوگ اسے اپنے آپ اپنالیں۔ آپ نے اردو ہندی کے جھگڑے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ اردو زبان غیر ملکی زبان ہے وہ غلط کہتے ہیں۔ آپ نے اس بات پر بھی زور دیا کہ انگریزی کو ہندستان سے نکالنا سخت غلطی ہے۔ انگریزی کے مقابلے میں ہندستان کی کوئی زبان ترقی یافتہ نہیں ہے۔ ٹیکنیکل علم کے لئے ہمیں انگریزی کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

آچاریہ ونوبھاوے نے بھی انگریزی کو برقرار رکھنے پر زور دیا ہے۔

روس میں اردو ادب

ماسکو (تاس) گزشتہ سال کے آخر میں کرشن چندر سوویت یونین آئے تھے۔ اور ماسکو کے ریلوے مزدوروں کی پڑھنے والی کانفرنس نے انھیں دعوت دی جس میں ان ہی کی تصنیفات پر بحث ہونے والی تھی۔ ہر ادیب اور شاعر کو یہ سن کر خوشی ہوئی کہ لوگ اس کے نام سے واقف ہیں اور بہت سے لوگ اس کی تصنیفات سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ مزدوروں نے جب بیان کرنا شروع کیا کہ ان کی حقیقت پسندانہ کہانیاں پڑھ کر جن میں عام انسان سے محبت کا جذبہ کارفرما ہے۔ ان کے دل ودماغ پر کیا اثر پڑا۔ کرشن چندر کو حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ مقرروں نے کہا سوویت عوام کرشن چندر کی تصنیفات سے بہت محبت کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہماری دلی خواہش ہے کہ آپ کو اس مقدس فریضے میں اور بھی کامیابی نصیب ہو۔

کرشن چندر نے جو کچھ سنا اس سے وہ بہت متاثر ہوئے اپنی تقریر میں انھوں نے کہا کہ مجھے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاید میری تصنیفات ہندستان سے زیادہ سوویت یونین میں مقبول ہیں ظاہر ہے انھوں نے مبالغے سے کام لیا اور شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ انھیں احساس ہے کہ سوویت عوام اردو ادب کی بہت قدر کرتے ہیں اس زبان کے ممتاز ادیبوں سے واقف ہیں اور ان سے محبت کرتے ہیں۔

آج کے لکھنے والوں میں کرشن چندر وہ پہلے ادیب ہیں جن کی تصنیفات سے سوویت عوام اچھی طرح واقف ہوئے۔ یہ کوئی اتفاقی بات نہیں ہے کہ ان کی کہانیاں یکے بعد دیگرے سوویت رسالوں "او گونیک"، "اسمینا" اور "نوائے میر" میں آج سے پانچ سات برس پہلے شائع ہونا شروع ہوئیں۔ اپنی کہانیوں میں کرشن چندر محنت کش انسانوں، کسانوں، معمولی کلرکوں اور فوجیوں کی زندگی ان کی جدوجہد اور امیدوں اور خواہشوں کو بڑی ہمدردی اور پیار سے بیان کرتے ہیں سوویت قارئین کو کرشن چندر کی یہ کہانیاں خاص طور پر پسند ہیں۔ "پورے چاند کی رات"، "میں انتظار کروں گا" اور "کالو بھنگی"۔ ان کا ناول "جب کھیت جاگے" بہت مقبول ہے جو سوویت یونین میں تین بار شائع ہوچکا ہے۔ ۱۹۵۵ء میں بدیشی زبانوں کے اشاعت گھر نے اس مشہور ناول نگار کی تخلیقات کو اور بھی مناسب طریقے سے پیش کرنے کی پہلی کوشش کی اور "منتخب تصانیف" کے عنوان سے ان کی کہانیوں کا مجموعہ شائع کیا جسے بہت پسند کیا گیا۔ کہانی اور شاعری کا ریاستی اشاعت گھر آج کل کرشن چندر کی کہانیوں کا دوسرا مجموعہ تیار کررہا ہے اور بدیشی زبانوں کے اشاعت گھر میں ان کا ناول "شکست" شائع ہوا ہے۔

اردو اور ہندی کے مشہور ادیب پریم چند کے نام سے سوویت یونین کے لوگ بخوبی واقف ہیں ۱۹۵۵ء میں ان کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ "ٹھاکر کا کنواں" کے نام سے شائع ہوا اور ۱۹۵۷ء میں ان کا ناول "گئودان" روسی زبان میں شائع ہوا۔ آج کل ان کی بہت سی کہانیوں اور ناولوں کا ترجمہ کیا جارہا ہے۔ ۱۹۵۴ء میں پہلی بار کوشش کی گئی کہ ہندستان کے اردو ادیبوں کی منتخب تصانیف کا ایک مجموعہ شائع کیا جائے۔ اس مجموعے نے جس کا عنوان ہے "ہندستان اور پاکستان کی مختصر کہانیاں" سوویت قارئین کو خواجہ احمد عباس، ابراہیم جلیس، رضیہ بیگم، مسعود محمد، جعفری اور احمد ندیم قاسمی جیسے اردو افسانہ نگاروں سے روشناس کرایا۔ حال ہی میں عظیم شاعر اقبال کی کئی نظموں کا ترجمہ شائع ہوا اور سردار جعفری کی طویل نظم "ایشیا جاگ اٹھا" بھی شائع ہوئی ہے۔

آئندہ چند سالوں میں اردو کی بہت سی کتابوں کے ترجمے شائع ہوں گے جن میں شاعری کے مجموعے بھی ہوں گے۔

لندن سے ایک خط

مجتبیٰ! آپ کو مدت سے خط لکھنے کے ارادہ میں ہوں اور اب داستان اتنی لمبی ہو گئی ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کہاں سے شروع کروں اور شروع کروں تو بیان کہ رسائد ہ میں ایران، شام، ترکی، یونان اور اطالیہ میں ٹھہرتا ہوا یہاں آیا ہوں۔ ان ملکوں کے قیام نے ایک MENTAL LANDSCAPE فراہم کردیا ہے اس بڑے مرقع میں ہندستانی تہذیب کے خط و خال اور بھی بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ وٹے کن برٹش میوزیم اور انڈیا ہاؤس میں بڑا ذخیرہ ہے اور اس پر کامل عبور حاصل کرنے کے لئے ایک عمر چاہئے بہرحال لگا ہوا ہوں اور اپنے خدا سے مایوس نہیں ہوں۔ سماجی زندگی کا کام مشکل ہے لیکن بڑا ہی دلچسپ، بقول شخصے MORE POETICAL THAN ALL SHELLEY AND MORE ROMANTIC THAN ALL SCOTT مشکل اس اعتبار سے کہ وہ اقتصادی اور سیاسی تاریخ کی درمیانی کڑی ہے سیاسی تبدیلیاں تو سطح پر نظر آجاتی ہیں لیکن سماجی زندگی کا دھارا بہت آہستہ آہستہ نیچے نیچے بہتا ہے۔

یہاں پٹرول کی نایابی نے زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ ایک ایک قطرے کا حساب غالب کے خون جگر سے زیادہ سخت ہو رہا ہے۔ گرانی بڑھتی جاتی ہے۔ اور اسی رفتار سے قلق سے عیش رفتہ کا تقاضا اور شکایت بھی!

دلّی کے جلسوں کا حال یونسکو کے ترجمان مسٹر ... سے معلوم ہوا انھوں نے لندن میں تقریر کی اور تصویریں دکھائیں مجھے اس جلسہ کی صدارت کرنا پڑی آپ کو معلوم ہے کہ میں ان ایام و لیالی کا آدمی نہیں۔ بالکل اس پہلوان کا سا حال تھا جو ایک مرتبہ منبر پر آگیا تھا! لیکن شام کے اخبارات کہتے ہیں کہ دونوں تقریریں بڑی شگفتہ اور معقول تھیں۔ یہاں کے پریس ٹرسٹ میں بھی چھ سات دفعہ شرکت کی۔ ایک سیمینار جو METHODOLOGY OF RESEARCH پر تھا اس میں بھی شامل ہوا اس میں خاص طور پر MATERIAL STATISTICS واقعات کا قطب مینار کھڑا کر دینے کو منع کیا گیا۔ اور کہا گیا کہ واقعات اہم ہیں لیکن ان سے بھی زیادہ اہم واقعات کا باہمی رشتہ ہے۔ بے اختیار آپ کی بعض تحریریں یاد آگئیں۔ اس لئے کہ وہ واقعات کی کھتونی نہیں۔ ان کا امتیازی وصف یہی ہے کہ ان میں ان باہمی رشتوں پر زور دیا گیا ہے۔ گویا لکھنے والے کی حیثیت راوی کی یا تحقیق کرنے والے کی حیثیت گورکن DIGGER کی نہ ہو۔ چند دن ان ہی موضوعات پر بحثیں رہیں۔ اچھے لوگ جمع تھے۔

یہاں کے تھیٹر بہت پسند آئے۔ ابھی ایک کھیل دیکھا A VIEW FROM THE BRIDGE یہ ممنوعہ کھیل ہے صرف بالغ دیکھ سکتے ہیں۔ قصہ یہ ہے کہ ایک سن رسیدہ شخص ایک لڑکی کو پالتا ہے لیکن اس سے جنسی محبت کرنے لگتا ہے (یہ جزو قابل اعتراض نہیں)، ایک اطالوی نوجوان اس گھر میں مہمان آتا ہے اور وہ اس لڑکی سے محبت کرنے لگتا ہے۔ اس معمر آدمی کو یہ بات ناگوار معلوم ہوتی ہے اور وہ اس نوجوان کو ذلیل کرنے کے لئے ایک موقع پر اسی کو پیار کرلیتا ہے (یہ ٹکڑا قابل اعتراض ہے) ایک خاتون میرے قریب بیٹھی تھیں۔ میں نے پوچھا اس میں اعتراض کی ایسی کیا بات ہے۔ یہ میرے دوست (اینڈریو) بیٹھے ہیں میں ہندستان اور CONTINENT کے بعض ملکوں کے رسم و رواج کے مطابق ان کو پیار کرسکتا ہوں۔ اس میں کوئی اعتراض کی بات تو نہیں۔ کہنے لگیں: "اگر آپ ان کو پیار کریں گے تو لارڈ چیمبرلین کے سپاہی آپ کو گرفتار کرلیں گے اور مجھے کریں گے تو سب آپ کے حسن انتخاب کی داد دیں گے"!

انگلستان غریب ہوگیا ہے۔ یہ غربت اتنی ہے کہ میں سے چکھ سکتا ہوں، چھو سکتا ہوں۔ عام آدمی "کل" کی دنیا میں رہتا ہے۔ لیکن پڑھے لکھے لوگوں میں بڑی توانائی ہے اور وہ نئی زندگی شروع کرنے کے آرزومند ہیں۔ افسوس ہے کہ ان کی تعداد زیادہ نہیں۔ لوگ کم آمیز ہیں لیکن جب ملتے ہیں تو اس طرح کہ سارا وقت کھل جاتا ہے یہاں کے اہل علم کی شفقتوں کو میں نہیں بھول سکتا۔

اردو کے ریکارڈ خاص طور پر آزادہ اور ... کے ... بغداد، دمشق، بیروت، استنبول اور لندن میں ... نہایت مقبول ہیں۔

خواجہ احمد فاروقی

مراسلات

اور غالب پیدا ہوں اور اردو کی

مشکلات پر غالب آئیں

مکرمی! تسلیم!

بندہ مندرجہ بالا کے زیر اہتمام رکھے گئے مذاکرے کے حالات قلم بند کر کے بھیج رہا ہے بڑی مہربانی ہوگی اگر آپ اپنے ہفتہ وار پرچے "ہماری زبان" میں چھاپ کر مشکور فرمائیں۔

دبے کالج بیجاپور میں بزم اردو کی طرف سے مرزا غالب پر ۱۰ دسمبر ۱۹۵۷ء کو ایک شاندار مذاکرہ رکھا گیا تھا جس کی صدارت جناب شری دھرم چھترے نائب صدر انجمن ترقی اردو ہند شاخ بیجاپور نے انجام دی۔ مذاکرے کا آغاز مرزا غالب کی چند غزلوں سے ہوا۔ اس کے بعد طلبا نے مرزا غالب کی شخصیت، شاعری و ادبی مرتبہ سے تعلق رکھنے والے مختلف موضوعات پر تقاریر کیں۔ آخر میں صدارتی تقریر میں جناب چھترے صاحب نے مرزا کے متعدد اشعار کا مطلب مختلف پیراؤں میں بتا کر طلبا کے ادبی ذوق میں اضافہ کیا اور اپنی تقریر کے دوران میں یہ بھی فرمایا کہ اردو جن مشکلات کے دور میں آج گزر رہی ہے اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ اور بھی بہت سے غالب پھر سے پیدا ہوں تاکہ وہ اردو کی مشکلات پر غالب آ جائیں۔

(خص) محبوب خان غزالی

سکریٹری بزم اردو۔ دبے کالج بیجاپور

ارباب اردو زندہ ہیں

مکرمی۔ تسلیم!

اخبار ہماری زبان اپنے روز اول ہی سے میرے مطالعے میں ہے۔ اس کی اشاعت و ادارت میں جو کچھ تغیر و تبدل اور نشیب و فراز ہوئے ہیں وہ سب میری آنکھوں کے سامنے ہیں میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ موجودہ انتظام سے اخبار کی دلچسپیوں میں نمایاں ترقی ہوئی ہے۔ خصوصاً اس کا ہفتہ وار ہو جانا بڑی خوشگوار تبدیلی ہے۔ اب یہ اخبار ایک طرف قاری کے سامنے دنیائے اردو کی ہر سمت کی خبریں پے بہ پے پیش کر رہا ہے اور دوسری جانب اس امر کا ثبوت بھی ہے کہ ارباب اردو زندہ ہیں اور جدوجہد میں سست گام نہیں۔

✽ اداریے کے صفحات میں اردو کے مسئلہ کو جس طرح پیش کیا جا رہا ہے وہ

وسط ایشیا کے ادیبوں کی علی گڑھ میں آمد

علی گڑھ ۶ جنوری کو مرزا ترسون زادہ تاجکستان کے مشہور فارسی شاعر، مہدی حسین ترکمانی شاعر اور قرا سید آذربائیجان کے مصنف مع ایک ترجمان کے علی گڑھ تشریف لائے۔ انھوں نے وائس چانسلر کے یہاں لنچ تناول کیا۔ اس کے بعد یونیورسٹی لائبریری اور انجمن ترقی اردو ہند کے صدر دفتر میں تشریف لے گئے۔ سکریٹری نے انجمن کی کچھ جدید مطبوعات وفد کی نذر کیں جس پر انھوں نے بڑی مسرت کا اظہار کیا۔ یونین کی طرف سے ۴ بجے ان کا خیر مقدم کیا گیا اور ۵ بجے شام کو اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے چائے کی دعوت ہوئی۔ مرزا ترسون زادہ صدر وفد نے تقریر کی اور وسط ایشیا اور ہندستان کے تہذیبی رشتوں پر زور دیا۔ انھوں نے یونیورسٹی کو اپنے ملک کے بنے ہوئے چند خوبصورت تحفے بھی پیش کئے۔ وفد کے ساتھ جو ترجمان تھی وہ نہایت صاف اردو بولتی تھی اور جدید اردو ادب کے بیشتر کارناموں سے واقف تھی۔

جگر صاحب علی گڑھ میں

چند روز ہوئے حضرت جگر مرادآبادی علی گڑھ تشریف لائے اور پروفیسر رشید احمد صدیقی کے یہاں قیام فرمایا۔ جگر صاحب کے کلام کا انتخاب انجمن سے شائع ہو رہا ہے اس کے متعلق سکریٹری صاحب سے گفتگو ہوئی۔ ہمیں اس اعلان میں بڑی مسرت ہے کہ جگر صاحب نے انجمن کے کاموں میں پوری مدد دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔ ان کے نئے مجموعے "آتش گل" کے ہندستانی ایڈیشن کی طباعت کے بھی انتظامات ہو رہے ہیں۔

✽ نہ صرف اقتضائے وقت کے مطابق ہے بلکہ میرے خیال میں صحیح طریق کار بھی ہے۔ جذبات کی بے پایاں شدت اور طغیانی کے بجائے سنجیدگی، توازن اور اعتدال کی مہریں ہر سطر پر لگی ہوتی ہیں۔ عنوانات۔ اردو دنیا، انجمن کی خبریں، بحث اور معاصرین۔ سبھی خیال انگیز اور بصیرت افروز ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ امر قابل گزارش ہے کہ اختصار سے کام نہ لیں۔ کسی شہر اور مقام کی ادبی سرگرمیوں کی رو داد میں وہاں کی سماجی اور تمدنی زندگی کی تفصیلات درج ہوتی ہیں جو مفید معلومات ہیں۔

ادھر کئی خطبات صدارت باقاعدہ شائع ہوئے ہیں جو قیمتی مسودہ کی حیثیت رکھتے ہیں خصوصاً سند یافتہ کے معیار اور حضرات صدور کے ناموں سے آگاہی کے بعد مسرت دو گونہ ہو جاتی ہے۔ اور گمان ہی نہیں یقین ہوتا ہے کہ اردو واقعی سرمایہ مشترکہ ہے۔

تازہ ترین اشاعت (۲۲ دسمبر ۵۷ء) میں "اردو شاعروں اور ادیبوں" کے زیر عنوان جو خیالات تحریر میں آئے ہیں ان سے مجھے لفظاً لفظاً اتفاق ہے مقامی ماحول، آفاقیت، انسانیت، اور ہندستانیت [illegible] اچھی طرح ہوا

معاصرین

ادب پر سیاست کا غلبہ

اس ہفتہ دہلی میں ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس ہوئی جس میں اس مسئلہ پر زور دیا گیا کہ ادب اور لٹریچر پر سیاست کا غلبہ نہ ہونا چاہئے اور کسی کو یہ حق حاصل نہ ہو کہ وہ ایک ادیب کو یہ حکم دے کہ اسے کیا لکھنا ہے اور کس طرح لکھنا ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا ادیب۔ سرمایہ داری اور سیاست کے غلبہ سے آزاد ہو سکتا ہے۔ اگر ادیب کو پیٹ خالی ہو اور یہ معاش سے بے فکر نہ ہو کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ آج نہیں آج سے سینکڑوں اور ہزارہا برس پہلے بھی مصنفین اور شعرا نے بادشاہوں کی تعریف میں قصیدے لکھے۔ غالب کے خطوط سے ظاہر ہے کہ آپ بادشاہ وقت کی تعریف کرنے کے لئے مجبور تھے اور جب بادشاہ معتوب ہوا تو آپ کو انگریز حکام کی درباری کرنی پڑی۔ ڈاکٹر اقبال نے اپنی تصانیف ریاستوں کے وزراء کے نام ڈیڈی کیٹ کیں۔ مسٹر حفیظ جالندھری نے جنگ کے زمانے میں انگریزوں کو خوش کرنے کے لئے "دیں چھورے کو بھرتی کرا آئی آں"۔ جیسے خلاف ذہنیت کے گیت لکھے اور حضرت جوش کو تو اس زندگی میں نہیں اُن کی روح کو دوسری دنیا میں بھی افسوس ہوگا کہ آپ نے "جو ہوا" جیسے فلمی گیت لکھے جن کی جوش جیسے ایک بلند ترین شاعر انقلاب سے توقع نہیں کی جا سکتی تھی اور آج بھی اگر تحقیقات کی جائے تو ہندستان میں درجنوں نہیں سینکڑوں ادیب ایسے ملیں گے جو امریکہ کے حق میں پراپاگنڈہ کرنے میں مصروف ہیں کیونکہ بازار میں تو ان کے مضامین کی قیمت شاید ایک روپیہ صفحہ ہو مگر امریکن پراپاگنڈا کرانے والے ان کو پانچ پانچ اور دس دس روپیہ صفحہ دیتے ہیں۔

ادب اور لٹریچر کو سیاست یا سرمایہ داری کے غلبہ سے نجات دینے کی صورت صرف ایک ہی ہے کہ ادیبوں شعراء اور مصنفین کو مالی مشکلات سے نجات دی جائے تاکہ یہ لوگ ذریعہ معاش سے بے نیاز ہو کر وہ کچھ لکھیں جو وہ چاہتے ہوں اور ان کا ذہن سیاست حکومت یا سرمایہ داری سے مغلوب نہ ہو۔ ورنہ اگر ان کی مالی پریشانیاں قائم رہیں تو ادب اور لٹریچر سرمایہ کے ہاتھوں فروخت ہوتا ہی چلا جائے گا۔ ادب فروشی کو کوئی روک نہیں سکتی۔

(ریاست دہلی)

> ہماری زبان کی سالانہ قیمت تین روپے ہے
> منی آرڈر سے صرف ۲ اور وی پی سے صرف آنے ہے۔

اردو میری زندگی ٹھہری .....

(کاروان ادب بمبئی)

میں نے اردو کو نئے الفاظ اور نئی تشبیہات اور نئے استعارے دئے ہیں۔ میرا دل اتنا کچھ کرنے اور کہنے پر مطمئن نہیں ہوا چاہتا ہوں کہ اردو کے لئے وہ کچھ کر جاؤں جو اب تک کسی نے نہ کیا ہو شعر میری زندگی۔ اور اردو اس کا ذریعہ۔ اس طرح اردو میری زندگی ٹھہری۔ اور اپنی زندگی سے کسے محبت نہیں ہوتی۔

(فراق گورکھپوری)

ہماری زبان

(کاروان ادب بمبئی)

تم کہتے ہو ہندستان میں اردو کی قدر نہیں ہوگی یہ تمہارا وہم ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ اردو کا نام ہندستان میں "ہندی" رکھ دیا جائے۔ لیکن یہ ممکن نہیں کہ لوگ اردو کی بجائے ہندی بولنا شروع کردیں۔ اردو ایک زندہ زبان ہے اور اس میں اتنی تازگی اور رعنائی ہے کہ وہ ہر رقیب کو پچھاڑ سکتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس نے اب تک ہر رقیب کو چاروں شانوں چت نہیں گرایا۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو اس کا وجود کبھی کا ختم ہو گیا ہوتا۔ اگر ہندی زبان کے کروڑوں حامیوں کے باوجود اردو پھولتی اور پھلتی رہی ہے تو اس کا سبب اس کی برتری ہے معجزہ نہیں مذہبی جنون یا سیاسی مصلحتیں اردو کو نیست و نابود نہیں کر سکتیں۔ کیونکہ اردو مذہب اور سیاست سے بے نیاز اور بالاتر ہے۔ اردو مسلمانوں کی زبان ہے نہ ہندوؤں کی۔ یہ رندان مے پرست کی زبان ہے اور جب تک دنیا میں ایک بھی رند باقی ہے اردو کے جام پئے جاتے اور لنڈھائے جائیں گے۔ عنقریب ہندستان اور پاکستان کو اردو کی ضرورت پڑے گی۔ اگر ان دونوں ممالک کو شریف ہمسایوں کی طرح رہنا ہے تو انہیں اردو کو مشترکہ ذریعہ اظہار بنانا ہوگا۔

(کنہیا لال کپور)

تبصرے

خرام

مصنف :- ہیش چندر نقش
ناشر :- مکتبہ قصر اردو - دہلی
قیمت :- دو روپے آٹھ آنے

ہیش چندر نقش ایک جواں عمر شاعر ہیں۔ ان کا کلام رسالوں میں بہت کم شائع ہوا ہے۔ دلی کے قیام کے باوجود دلی کے کسی مشاعرے میں بھی ان کی صورت نہیں دیکھی گئی۔ یہ ضبط توازن اور انداز بے نیازی نقش کی فنکارانہ شخصیت کو بہت دلکش بنا دیتا ہے اور یہ دیکھ کر ہمیں اور بھی مسرت ہوتی ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری میں صرف انھیں موضوعات کو برتنے کی کوشش کی ہے جو ان کے مزاج سے ہم آہنگ ہیں۔ شہرت کی ہوس میں انھوں نے بازار کے چلتے ہوئے سکوں کی پروا نہیں کی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کا مجموعہ حشو و زوائد سے پاک، خوبصورت شاعری کا نمونہ ہے اور ہر جگہ سلیقے اور نفاست کا پتہ چلتا ہے۔ نقش نے ابھی تک غزل اور نظم کو آزمایا ہے لیکن دونوں اصناف میں انھوں نے فن کے آداب کا خیال رکھا ہے۔ ان کے کلام میں کچھ نئی خوشبوئیں اور نئے رس بھی ہیں اور قدم قدم پر تازگی کا احساس ہوتا ہے۔

کہتے ہیں وہ جن رسیلے — مرنے والے اور بھی جی لے
کتنے ہی یہ صدیوں کے تراشے ہوئے اصنام — سوتا ہے کلاکار کلا جاگ رہی ہے
سدا میں ڈوبی کلی کی آنکھ کھلی — صبح انگڑائی لے کے جاگ اٹھی

دنیائے زندگی کی خوشیوں میں پلنے والی
اکثر ہوائے غم نے گیسو ترے سنوارے

"ابتدائیہ" فراق گورکھپوری نے لکھا ہے۔ لکھتے ہیں "خرام بہت خوبصورت لفظ ہے۔ اور اس میں صوتی لحاظ سے ایک نغمیت ہے۔ اور معنوی لحاظ سے وجدان کو متاثر کرنے کی صفت۔ شاعری کی خوش سلیقگی کا یہ نام غماز ہے"۔ یہ ایک فقرہ نقش کے کلام پر بڑی اچھی تنقید ہے۔ کتاب کے نام ہی کی طرح اس کی طباعت بھی بے حد حسین ہے۔ اور مکتبہ قصر اردو اس کی اشاعت پر مبارکباد کا مستحق ہے۔ جابجا محمد اسمٰعیل (آرٹسٹ) کی نقش گری کے نمونے بھی ہیں جو بہت دلپذیر ہیں۔

لہو ترنگ

مصنف :- سید ضمیر جعفری
ناشر :- مکتبہ کارواں۔ ایبک روڈ۔ انارکلی۔ لاہور
قیمت :- دو روپے

سید ضمیر جعفری صاحب پاکستان کے ایک فوجی افسر ہیں۔ ان کی نظموں میں حب الوطنی اور سپاہیانہ جوش شاعری کا عنصر بہت نمایاں ہے نظموں کے عنوانات سے ان کے موضوع کو آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔

"اے وطن جان من" "پاکستان ہمارا" "پاکستانی ہوابازوں کو سلام" "قائد اعظم" "بڑھتے چلو" "ملٹری اکیڈمی میں" "گرم خون دوستو" "ہم پرچم بردار ترے"

پیش لفظ جسٹس ایس۔ اے رحمان نے لکھا ہے۔ فرماتے ہیں "آج کل کا اردو ادب الا ماشاءاللہ قنوطیت کا صحرا ہے لیکن ضمیر جعفری نے خلوص، امید اور یقین کی آشوائی کی ہے جو عوامل حیات میں اہم مرتبہ رکھتے ہیں"۔

جزیروں کے گیت

مصنف :- سید ضمیر جعفری
ناشر :- مکتبہ کارواں۔ لاہور
قیمت :- دو روپے

ضمیر جعفری صاحب نے فوجی ملازمت کے سلسلے میں اپنی عمر کا ایک حصہ ملایا اور سماٹرا وغیرہ کے جزیروں میں گزارا ہے۔ اسی زمانے میں انھوں نے ان جزیروں کی ایک مخصوص صنف "پنتون" کو اردو لباس میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ پنتون پنجاب کے "ماہیا" اور سرحد کے "ٹپّہ" سے ملتی جلتی سی چیز ہے۔ جعفری صاحب نے ترجمہ بہت اچھا کیا ہے اور اس طور پر ہماری زبان کے سرمائے میں خوبصورت اضافہ کیا ہے۔ نمونے کے طور پر ایک "پنتون" کا ترجمہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

سرو پا دُکھی شباب چادر تلے چھپ کے بیٹھی ہیں یوں کونپلیں دھان کی۔
جیسے سیلان گر کی حسین جھیل میں مدتوں کے حسین راز سوئے ہوئے
جیسے جنگل کے نیلم میں پریوں کے دل سہمے سہمے ہوئے کھوئے کھوئے ہوئے
جیسے خوابوں میں تارے چمکتے ہوئے جیسے دل میں تمنائیں انسان کی

کتاب کے شروع میں چراغ حسن حسرت مرحوم کا لکھا ہوا دیباچہ شامل ہے۔

ادیب کے سو شعر

مصنف :- لعل محمد خاں ادیب
ناشر :- کاشانۂ ادب کراچی
قیمت :- چار آنے

لعل محمد خاں ادیب کراچی کے ایک گمنام سپاہی ہیں۔ فرصت کے اوقات میں انھوں نے شعر کی دیوی کی پوجا کی ہے اور اپنے اشعار کا ایک مختصر انتخاب بڑے انکسار کے ساتھ پیش کیا ہے۔ کلام پر اخلاقی رنگ غالب ہے اور ضرب الامثال اور محاورات کو نظم کرنے کا بھی شوق ہے۔ بہت سے شعر انھوں نے اپنی زبان کی محبت میں سرشار ہو کر کہے ہیں۔ جو ہر طرح قابل تعریف ہیں۔

(خلیل الرحمٰن اعظمی)

اطہر پرویز پرنٹر پبلشر نے نشیل پرنٹنگ پریس میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا